قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا علمی و تحقیقی جریدہ

فکر و تحقیق

نئی دہلی

اپریل—جون 2019

جلد22، شمارہ 2

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language
Quarterly **"FIKR-O-TAHQEEQ"** New Delhi
Vol. 22. April to June, 2019, Issue-2

فکر و تحقیق سہ ماہی نئی دہلی

قیمت : 25 روپے
طابع اور ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
محکمۂ اعلیٰ تعلیم، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

رابطہ : مدیر، فون: 49539000، فیکس: 49539099، شعبۂ ادارت: 49539009
ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in.
ای میل : ft.ncpul@gmail.com
خط و کتابت کا پتہ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 'فروغ اردو بھون' FC-33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

زرِ سالانہ : عام ڈاک سے: 100 روپے، رجسٹرڈ ڈاک سے: 200 روپے
❑ ڈرافٹ : NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔ شعبۂ فروخت کے پتے پر بھیجیں۔
❑ شعبۂ فروخت : ویسٹ بلاک۔8، ونگ۔7، آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159،
ای۔میل:۔ sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
❑ شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس، بلاک نمبر: 5-1، پتھر گٹی
حیدر آباد۔500002 (تلنگانہ)، فون: 040-24415194

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ایس. نرائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز۔II، نئی دہلی 110020
میں 70 GSM TNPL پیپر پر چھپوا کر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،
''فروغ اردو بھون'' FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025 سے شائع کیا۔

مندرجات

حرفِ اوّل

جامعات میں تحقیق کے منہج اور معیار پر اب وہ شخصیتیں بھی سوال اٹھانے لگی ہیں جن کا براہِ راست جامعات سے رشتہ ہے۔ ان حضرات کی رائے ہے کہ جامعات میں تحقیق کا معیار گرا ہے اور ان موضوعات کو بھی تحقیق میں شامل کیا جا رہا ہے جن کی موجودہ عہد میں کوئی افادیت نہیں ہے۔ پہلے بھی تحقیق کے معیار پر سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں، تحقیق کی نارسائیوں اور محرومیوں کے حوالے سے بھی گفتگو ہوتی رہی ہے مگر اب جب یہ سوالات خود جامعات کے اندر سے اٹھ رہے ہیں تو معیارِ تحقیق پر اب سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے۔ آج کی تحقیق کا المیہ یہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر کئی جامعات میں تحقیق ہو رہی ہے اور ایک ہی شخصیت کو تحقیق کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اردو میں تحقیقی موضوعات کا فقدان یا بحران ہے جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع کی تکرار ملک کی مختلف جامعات میں ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح سے ہماری اردو تحقیق چند موضوعات میں محصور اور محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ معاملہ یہ بھی ہے کہ تحقیق کرنے والے طلبا اپنے موضوع کے تئیں سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کاتا اور لے دوڑی پر عمل کرتے ہیں۔ جو ارتکاز، انہماک، ریاضت، عرق ریزی تحقیق میں ہونی چاہیے وہ نہیں ہو پاتی۔ ان لوگوں کا مقصد صرف ڈگریوں کا حصول ہوتا ہے اس لیے یہ محنت سے جی چراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد میں مستثنیات کو چھوڑ کر بیشتر تحقیقی مقالے ایسے ہیں جو شائع نہیں کیے جا سکتے۔ افسوسناک بات تو یہ بھی ہے کہ کچھ تحقیقی مقالے من و عن پرانی کتابوں سے ماخوذ ہوتے ہیں اور وہ بغیر کسی ترمیم و اضافے کے شائع بھی کر دیے جاتے ہیں۔ یہ جرأت اور جسارت قابل مذمت ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے اس طرح کے بہت سے واقعات سامنے آئے کہ پاکستان میں چھپی ہوئی کتاب کو من و عن تحقیقی مقالے کی صورت میں ڈگری کے لیے پیش کر دیا گیا اور بعد میں وہ کتاب شائع بھی ہو گئی۔ اس طرح کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اردو تحقیق میں سرقے کا چلن عام ہو چکا ہے۔ پہلے بھی سرقے کے تعلق سے بعض معتبر اور مؤقر جرائد نے بہت سے اہم انکشافات کیے ہیں جن سے پتہ چلا کہ بہت سی شخصیات نے دوسروں کے تحقیقی مقالوں اور اقتباسات پر

شب خون مارا ہے اور اس میں کہیں بھی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال اردو تحقیق کے لیے بہتر نہیں ہے اسی لیے اب جامعات کے اساتذہ بھی اردو تحقیق کے معیار سے عدم اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن سوال صرف عدم اطمینان کا نہیں ہے بلکہ تحقیق میں دَر آئی اس بیماری کے علاج کا بھی ہے۔ تحقیق کی یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے جامعات میں ایک ایسی کمیٹی تشکیل دیے جانے کی ضرورت ہے جہاں ماہرین کی ایک جماعت ہو اور وہ سرقے پر نگاہ رکھ سکیں تا کہ جو تحقیقی مقالے سرقے سے پاک نہیں ہیں ان پر ڈگری تفویض نہ کی جا سکے اور اس کے علاوہ تمام جامعات کے تحقیقی مقالات کا ایک توضیحی اشاریہ بھی شائع کیا جانا چاہیے تا کہ تحقیقی موضوعات میں تکرار اور یکسانیت سے بچا جا سکے۔ تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے جامعات کے ارباب حل وعقد کو کچھ اقدامات کرنے پڑیں گے ورنہ تحقیق کی کوئی اہمیت اور افادیت نہیں رہ جائے گی۔

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' بھی تحقیق سے جڑا ہوا ایک مجلّہ ہے اس لیے اس رسالے کے سامنے بھی اسی طرح کی دقتیں آتی رہی ہیں۔ عموماً آج کے محققین تحقیقی موضوعات پر زیادہ توجہ نہیں دیتے جب کہ پہلے کے مقابلے میں آج وسائل کی کثرت ہے، انٹرنیٹ پر بھی معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے، نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں، اس کے باوجود اگر تحقیق کمزور ہوتی جا رہی ہے تو یقیناً یہ بہت تشویشناک مسئلہ ہے۔

'فکر و تحقیق' کے اس شمارے میں کچھ اہم تحقیقی مقالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان مقالوں میں کچھ نئی جہتوں کا انکشاف بھی ہے، خاص طور پر ماہنامہ 'شاعر' امروہہ'، 'اٹھارہ سوستاون کا نشان دہندہ'، 'نصیر حسین خیال کی نثر نگاری' وغیرہ اس طرح کے مضامین ہیں جن سے ہمیں نئی روشنی مل سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح کے موضوعات کا انتخاب کیا جائے تا کہ تحقیق کا معیار بھی بلند ہو اور ہماری معلومات میں اضافہ بھی۔

فکر و تحقیق' میں کچھ نئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ تلخیص اور کلیدی الفاظ کی شمولیت کو بیشتر قارئین نے سراہا ہے اور آئندہ کوشش ہوگی کہ 'فکر و تحقیق' میں لکھنے والے قلم کاروں کا تعارف بھی پیش کیا جائے تا کہ اِن کے علمی اور ادبی آثار و کوائف سے ہمارے قارئین بھی آگاہ ہو سکیں۔

شیخ عقیل احمد

ارشد مسعود ہاشمی

نصیر حسین خیال کی نثر نگاری

تلخیص

نصیر حسین خیال بہار کے صف اول کے نثر نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ان کی نثر نگاری کا مطالعہ محض 'مغل اور اردو' اور 'داستان اردو' کی روشنی میں کیا جاتا رہا ہے۔ ان مطالعات میں ایک عام رجحان یہ نظر آتا ہے کہ وہ خیال کے یہاں مولوی محمد حسین آزاد یا مولانا ابوالکلام آزاد کے اثرات کی جستجو پہ ہی محیط ہے۔ خیال کی نثر نگاری کی دوسری قابل قدر مثالیں بھی موجود ہیں جن کا مطالعہ منظر عام پہ نہیں آ سکا ہے۔ پیش نظر تحریر میں اُن کی دیگر دو اہم نگارشات کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے یہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خیال انفرادی اسلوب نثر کے مالک تھے۔

کلیدی الفاظ

نصیر حسین خیال، مغل اور اردو، داستان اردو، داستان عجم، انشائیہ نگاری، عظیم آباد، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، رسالہ ادیب، شیکسپیئر، العصر، حبل المتین، محاکاتی اسلوب

بہار کے صف اول کے سنجیدہ اور صاحب طرز نثر نگاروں میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سید امداد امام اثر، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، عبدالغفور شہباز، نصیر حسین خیال، سید سلیمان ندوی اور حمید عظیم آبادی کے اسمائے گرامی ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی خدمات اردو نثر نگاری کی تاریخ کا زریں باب ہیں۔ ان ارباب فضل و کمال میں نصیر حسین خیال اپنی انشا پردازی کی وجہ سے ممتاز تصور کیے جاتے ہیں (ہاشمی 149)۔ ان کا تعلق عظیم آباد کے اس خانوادہ سے تھا جس نے دو صدیوں تک اردو پروری کی تھی۔ انھوں نے تادم عمر خاندان کی اس وراثت کی پاسداری کی۔ وہ زبان داں تھے اور نثر نگاری کے شیدائی۔ ماموں شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے باوجود انھوں نے اوائل عمری میں ہی درستگیٔ زبان، نثر کی خدمت اور اردو کے حقوق کے حصول کے لیے شاعری ترک کر دی۔

خیال کو اب تک ان کی صرف دو تصانیف 'داستان اردو' اور 'مغل اور اردو' کی روشنی میں دیکھا جاتا رہا ہے جبکہ ان کی نثری خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان کی تحریروں میں موضوعات اور اسالیب کا تنوع

موجود ہے۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز تھے، قوموں کی ثقافتی تاریخ کے نبض شناس بھی؛ بالغ نظر مبصر ادب تھے، مکتوب نگار اور انشائیہ نگار بھی۔ ان کی زندگی اور تحریروں کا صرف ایک نصب العین تھا۔ وہ اردو دانوں کو اس زبان کی عظمت وانفرادیت کا احساس عطا کرتے ہوئے اس سے وابستہ ان تمام ثقافتی اور اخلاقی قدروں کو زندہ وتابندہ دیکھنا چاہتے تھے جنھوں نے اس کی تشکیل اور نشوونما میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ خیال محبّ وطن تھے، ہندو مسلم اتحاد کے حامی و پیامبر اور مشترکہ قومی کلچر کے ثنا خواں بھی تھے۔ انھیں ہندوستانی رزمیوں سے وابستہ ادبی روایتیں اتنی ہی عزیز تھیں جتنی 'شاہنامہ' اور مراثیِ انیس کی روایتیں۔ وہ زبان اردو کے مخلص و ہمدرد خدمتگار تھے۔

نصیرحسین خیال کا تعلق انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے اوائل کے عظیم آباد اور کلکتہ سے تھا۔ عظیم آباد کے ان کے خانوادے نے تقریباً دوسو برسوں تک اردو پروری کی تھی۔ اس کی رئیسانہ شان وشوکت اور علمی وادبی سرگرمیوں کی بدولت؛ اس کی معاشرتی، تہذیبی اور ٹکسالی زبان کی وجہ سے یہ شہر دہلی کا نمونہ بن چکا تھا۔ خیال کے مورث اعلی عرب سے ایران آئے اور مغلوں کے زمانے میں انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ پھر اس خانوادے کے افراد فرخ سیر اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں پانی پت اور دہلی سے سوئے عظیم آباد آئے (ہاشمی 149)۔ مغلوں کے عہد میں اس خاندان نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس کے دو اصحاب، قطب الملک نواب سید عبداللہ خان اور امیرالامرا نواب سید حسین علی خان، بادشاہ گر کہلاتے تھے۔

خیال مشرق ومغرب کے کلاسیکی ادب اور اس کے ثقافتی پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان میں بیسویں صدی کے اوائل کی ان ملک گیر سرگرمیوں کے ایک کلیدی اور فعال رکن بھی تھے جن کا تعلق مسئلۂ زبان سے تھا۔ تاریخِ اقوام ان کا محبوب موضوع رہا ہے اور اس سلسلے میں مغربی مصنّفین کی تحریروں سے انھوں نے جا بجا استفادہ بھی کیا ہے۔ وہ مشرقی ثقافت، بطور خاص ہندوستان کی قدیم ثقافت اور مشترکہ ہندوستانی ثقافت کے ثناخواں تھے تو دوسری جانب مغربی تعلیم کے حامی بھی تھے۔ اس حمایت کے باوجود نوآبادکاروں کی ان حکمت عملیوں کی سخت مخالفت بھی کرتے تھے جن سے مشرقی اقدار مجروح ہوتی تھیں۔ تعلیم کے ایسے نوآبادیاتی نظام کی انھوں نے حتی الوسع تکذیب کی اور اس نظام کے پس پردہ موجود استعماری قوتوں کی اصل منشا کو بھی گرفت تفہیم میں لینے کی سعی کی ہے۔

شاد کی تربیت کی وجہ سے نصیرحسین خیال اوائل عمری میں شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن انھوں نے جلد ہی اس سے قطع تعلق کر لیا حتی کہ شاعری کا کوئی نمونہ محفوظ نہ رکھا۔ انھیں فارسی اور اردو پر اختیار کامل تھا، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ بدرالدین احمد نے ذکر کیا ہے کہ:

> ''یہ [خیال] بھی حضرت شاد کی شاعری سے کچھ دن استفادہ کرتے رہے مگر شاعری ان کے مزاج کے موافق نہ پڑی۔ یہ پہلے سے ہی اچھوتے اور نئے مضمون نثر میں

لکھتے اور اپنے نوعمر ساتھیوں کو سناتے اور خوب واہ واہ ہوتی۔ اس ہمت افزائی نے ان کی نثر نویسی کے شوق کو اور بڑھایا اور جب ان کے سن شعور نے خیالات میں پختگی پیدا کی تو ان کے قلم سے افادیاتی مضامین نکلنے لگے۔'' (497)

یہ شوق رفتہ رفتہ ایک جنون میں تبدیل ہوتا گیا جس نے انھیں ایک تحریکی مزاج بھی عطا کر دیا۔ عظیم آباد کی سابقہ ادبی روایتوں اور اپنے خاندان کی علمی وراثتوں کے وارث ہونے کی حیثیت سے زبان کی درستگی، نئے موضوعات کی پیشکش، اور علمی وقار کو بلند تر کرنے کی خواہش نے انھیں علمی اور عملی طور پہ ہمیشہ فعال رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدا سے ہی ان کے مراسم اصحاب اختیار اور اصحاب علم دونوں ہی سے تھے۔ بقول احمد (497)، ان کی ابتدائی زندگی کو دیکھنے والے اس وقت بھی یہ صحیح اندازہ لگاتے تھے کہ یہ کم سن لڑکا جو نوعمری میں بھی الفاظ کے تلفظ اور زبان کی صحت میں گفتگو کرتے وقت مبالغہ سے کام لیتا ہے، آخر میں ضرور ایک بڑا ادیب اور ایک صاحب طرز انشا پرداز ہوگا۔

شاعری کی خواب آگیں دنیا انھیں راس نہیں آئی۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے مدنظر وہ اسے لاحاصل تصور کرتے تھے کیونکہ ملک عزیز کے معاصر معاملات میں ان سے کسی قسم کی رہنمائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے اس خوابناک دنیا سے باہر نکل کر انشاپردازی کا سہارا لیا۔ ابھی عمر کی اٹھارہ منزلیں بھی طے نہ ہوئی تھیں کہ ان کے مضامین منظر عام پر آنے لگے۔ کلکتہ میں ان کی صحبتوں میں شریک رہنے والے پروفیسر محفوظ الحق کا بیان ہے کہ چونکہ علم و ادب اور زبان دانی کا خاندانی شوق کم عمری ہی سے تھا، اور قدرت نے بھی اس کے لیے موزوں دل و دماغ عطا کیا تھا، اس وجہ سے قلم وقرطاس کے علاوہ کسی اور طرف مائل نہیں ہوئے اور ہوش سنبھالتے ہی مضمون نگاری کی جانب متوجہ دکھائی دیے، اور اسی زمانہ میں حیدرآباد کے پرچہ 'حسن' میں فرضی ناموں سے ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔

اس ذہنی رجحان کا دوسرا بیّن ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اوائل عمری میں ہی اپنے دوست پیارے صاحب علی سجاد کے اشتراک سے 1897 میں عظیم آباد سے 'ادیب' نام کے اردو ماہنامے کا اجرا کیا۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی 1897 میں منظر عام پر آیا تھا جس میں خیال نے 'ادیب' کی اشاعت کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سرزمین بہار کی لسانی اور ادبی صورت حال سے بیزار ہونے کے سبب انھوں نے ایک ادبی انجمن کا قیام کیا ہے۔ اسی کے مقاصد کی برآوری کے لیے 'ادیب' کا اجرا کیا گیا ہے۔ خیال اور سجاد ہی اس رسالہ کے اہم مضمون نگار تھے۔ اس کے سلسلے میں بدرالدین احمد نے یہ صراحت پیش کی ہے کہ 'ادیب' میں جو مضامین نصیر حسین خیال نے لکھے وہ منفرد تھے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ نوعمری میں انھوں نے اردو زبان کو وہ اسلوب عطا کیا جو اسلوب زبان و ادب کو اکثر مصنّفین اور نثر نگار اپنی پختہ سالی میں دے سکے ہیں (497)۔

شائق احمد عثمانی نے لکھا ہے کہ جب اس کی اشاعت شروع ہوئی تو اس کی زبان اور طرز ادا پر ملک گرویدہ ہو گیا۔ ملک کا گرویدہ ہونا مبالغہ آرا بیان ہوسکتا ہے لیکن عظیم آباد کے پس منظر میں زبان کی اصلاح کے لیے یہ یقیناً ایک اہم ابتدا تھی۔

> ''یہاں (عظیم آباد) بہت کم ایسے رسالے شائع ہوتے تھے۔ بہار اور خصوصاً عظیم آباد نے اس رسالہ ادیب کی وجہ سے خاص شہرت اور ناموری حاصل کی۔ اس رسالے میں زیادہ تر آپ [خیال] اور آپ کے دوست مولوی سید علی سجاد مرحوم مضامین تحریر فرماتے تھے۔'' (مغل اور اردو 2)۔

یہ معاملہ قابل توجہ ہے کہ 'ادیب' کے مدیر و مشیر کے علاوہ ایسے لوگ برائے نام ہی تھے جن کا قلمی تعاون اس رسالے کو حاصل ہوا۔ 'ادیب' کے سرورق پہ رسالہ کے نام اور ماہ کے اندراج کے بعد لکھا ہوتا تھا:

> ''حسب الحکم ممبران اردو لٹریچر سوسائٹی و بہ نگرانی جناب سید نصیر حسین خان صاحب خیال (رئیس پٹنہ)، سکریٹری سوسائٹی، پٹنہ، عظیم آباد۔''

اشاعت کا مقام پٹنہ کا مکتبۂ قیصری تھا۔ اس کے شماروں کا ایک بڑا حصہ انگریزی ادب کے ترجموں یا انگریزی میں لکھی تاریخ و ادب کی کتابوں سے ماخوذ تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلم تہذیب و معاشرت اور اردو زبان کی صحت سے متعلق مضامین بھی شامل ہیں۔ 'ادیب' کا افتتاحی شمارہ یعنی جلد 1 نمبر 1، ماہ جولائی 1897 کا تھا۔ اس میں یہ تفصیل درج ہے کہ یہ رسالہ اردو لٹریچر سوسائٹی، پٹنہ کا ماہنامہ ترجمان ہے اور اسے سوسائٹی کے سکریٹری سید نصیر حسین خاں صاحب خیال کی نگرانی اور اہتمام میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اندراجات سے خیال کے ہی اس کے مدیر ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ رسالہ 14 x 1/2 22 س۔م۔ کے 32 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں اردو لٹریچر سوسائٹی کی تاسیس کی داستان اور اس کے قواعد و ضوابط بیان کیے گئے ہیں اور چند انشائیے اور افادی مضامین شامل ہیں۔ طرز تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ تمام مشمولات خیال کے قلم کے ہی رہین منت ہیں۔ اس کے بعد کے شماروں میں ان کے احباب کی تحریریں بھی شامل ہونے لگیں۔ اس کے ایک شمارے کا ذکر کرتے ہوئے سید بدرالدین احمد نے لکھا ہے کہ:

> ''بہت زمانے کی بات ہے، ایک دن مجھے 'ادیب' کے چند پرانے پرچے مل گئے تھے۔ ان میں شیکسپیئر کے مشہور ڈراما A Midsummer's Night Dream کا اردو ترجمہ نصیر حسین خیال کا لکھا ہوا بھی موجود تھا۔ میری نظر میں شیکسپیئر کا انگریزی اور بجنل ڈراما بھی تھا مگر مجھے حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ نصیر حسین خیال کے ترجمے میں بھی وہی جذبات کی رو، وہی الفاظ کی ہم آہنگی، وہی زبان کی سلاست اور اس کے گیتوں میں وہی مٹھاس اور رس ہے جو شیکسپیئر کی ڈراما نگاری کی اصلی روح ہے۔'' (8-497)

'ادیب' کا یہ شمارہ ستمبر 1897 کا ہے (الف)۔اس میں ایک نظم کے علاوہ کل سات نثری تحریریں شامل ہیں۔چار تحریریں مولوی سید علی سجاد کی ہیں جن کے عنوانات ہیں 'ریشمی کپڑوں کا رواج'، قدیم یونان کے میلے'، 'فال لینے کا رواج' اور 'زبان اردو'۔ خیال کی تحریروں میں متذکرہ ڈراما 'موسم بہار کی ایک رات کا خواب' کے علاوہ ایک انشائیہ 'کرشمۂ قدرت' شامل اشاعت ہے۔ایک تحریر بعنوان 'موت اور اس کی یاد' کے قلمکار سید محمد وصال ہیں۔ یہ بھی انشائیہ کے انداز میں ہے۔خیال کا ترجمہ اس کے بعد کے شماروں میں بھی شائع ہوا۔ جولائی میں پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد رفتہ رفتہ اس پرچہ کے لیے لکھنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔ یہ رسالہ دو برسوں تک شائع ہوتا رہا اور خیال کے کلکتہ جانے کے بعد بند ہو گیا۔

شیکسپیئر کے متذکرہ ڈراما کا ترجمہ دراصل Lamb's Tales from Shakespeare میں شامل اس ڈراما کی کہانی کا ترجمہ ہے، اور خود خیال نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔اس لیے اس ترجمے میں شیکسپیئر کے ڈراموں کی خوبیوں کی جستجو لا حاصل ہے۔ تاہم یہ ایک اہم پہلو ہے کہ خیال نے Lamb کے پیش کردہ قصے کو بہ حسن کمال اردو میں پیش کر دیا ہے۔اس ترجمہ کے ابتدائی حصے ملاحظہ فرمائیں:

> ''کسی زمانہ میں شہر ایتھنس میں ایک قانون تھا جس کی رو سے وہاں کے لوگ مجاز تھے جس سے چاہیں اپنی بیٹی بیاہ دیں۔اورلڑکیاں اگر انکار کرتیں تو باپ کو ان کی جان تک لینے کا اختیار تھا۔لیکن اولاد کی آگ بری ہوتی ہے۔باپ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے بچے قتل ہوں۔اسی وجہ سے شاذ و نادر یہ قانون عمل میں آتا۔بلکہ عموماً لڑکیوں کی ضدیں رکھ لی جاتیں اور اس سخت قانون کی صرف دھمکیاں ہی دی جاتی تھیں۔عمل درآمد کچھ نہ ہوتا تھا۔
>
> اسی زمانہ کے ایک بڑھے کی داستان ہے صرف۔جس سے اسی قسم کی مثال پائی جاتی ہے۔جس وقت تھیسیس وہاں کا فرمانروا تھا، ایک شخص ایجیس نامی نے دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ سے اپنی بیٹی کی دادخواہی چاہی۔عرض کی: میں نے اپنی بیٹی ہرمیہ پر تاکید کی کہ وہ اس شہر کے ایک نوجوان رئیس زادہ ڈمٹرس سے شادی کر لے مگر وہ ہمارا حکم نہ بجا لائی کیونکہ وہ ایک نوجوان لینڈر پر فریفتہ ہے۔اے بادشاہ، اپنا قانون جاری فرما۔میری بیٹی کو سزائے موت دے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔
>
> ہرمیہ نے اپنی نافرمانی کا یہ عذر پیش کیا کہ ڈمٹرس بہت دنوں سے میری دوست ہلینہ سے محبت کرتا ہے اور ہلینہ بھی اس کے عشق میں دیوانی ہے۔لیکن ایسے معقول عذر کی کچھ بھی سماعت نہ ہوئی۔بے رحم باپ ذرا نہ پسیجا، اور بیٹی کی ایک نہ سنی۔
>
> تھیسیس گو ایک صاحب وقار اور رحم دل بادشاہ تھا لیکن ملک کے قانون کو بدل نہ سکا۔ہرمیہ

کوصرف چار دن کی مہلت دی گئی کہ پھر اس پر غور کرو۔ اور اگر اس عرصہ میں بھی راضی نہ ہوتو اپنی جان سے ہاتھ دھو رکھے۔

ہرمیہ دربار شاہی سے رخصت ہو کر سیدھے اپنے عاشق لینڈر کے پاس پہنچی اور اپنا درد دل شروع سے آخر تک سنایا۔ پھر لینڈر سے مخاطب ہو کر بولی، پیارے، تم کیا کہتے ہو؟ تم کو چھوڑ کر ڈمٹرس کی ہو رہوں یا اپنا فیصلہ ہی کر ڈالوں (14-15)؟''

اس ترجمے میں موجود سلاست و روانی اور قصہ پن کے عناصر سے ظاہر ہے کہ خیال انگریزی کی تو اچھی واقفیت رکھتے ہی تھے، تخلیقی مزاج کے حامل بھی تھے۔ ان کی دوسری تحریروں میں بھی ان خوبیوں کے حامل عناصر موجود ہیں۔ بدرالدین احمد نے جس گیت کا ذکر کیا ہے وہ اسی ترجمہ میں موجود ہے۔ گیت سے پہلے کا مکالمہ دیکھیے:

''شہزادی: تم میں سے کچھ عورتیں جا کر گلاب کے ان کیڑوں کو ماریں جو کلیوں کو ستیاناس کرتے ہیں اور کچھ چمگادڑوں سے لڑیں۔ میں ان کی کھال کا شلوکہ بناؤں گی۔ کوئی جا کر رات میں چیخنے والے الو کو منع کر آئے کہ اپنی زبان بند کرے، شہزادی آرام کرتی ہے۔ مگر سب سے پہلے ایک گیت گاؤ کہ میں سو رہوں۔'' (21)

اس گیت کے ایک کورس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جس سے خیال کے شعری مزاج اور شاعرانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

میٹھے سروں میں بلبل دے اس گھڑی یہ لوری
لَلّا لَلّا لَلّابی لَلّا لَلّا لَلّابی
جادو نہ سحر کوئی آئے قریب اس کے
نقصان میری پیاری بیگم کو کچھ نہ پہنچے
لو ہوتی ہوں میں رخصت اب صبح پھر ملوں گی
لَلّا لَلّا لَلّابی لَلّا لَلّا لَلّابی

ترکِ شاعری کے باوجود سخن فہمی اور سخن سنجی کا ملکہ ہمیشہ موجود رہا۔ صہبائی (40) نے بیان کیا ہے کہ خیال نکتہ سنجی اور شاعری میں تخیل کی اہمیت و قدر و قیمت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس کی دوسری جھلک ہمیں ان کے انشائیہ 'پانچ ملک الشعرا' میں بھی ملتی ہے، جس میں انھوں نے نومشق شعرا کو نشانہ بناتے ہوئے اپنے خاص اسلوب میں لکھا کہ:

''اِن حضرات کی مثال تازی گھوڑے کی سی ہے۔ اصالت موجود لیکن اچھے شہسوار کی ران باگ دیکھی نہیں! قدم تو چلے مگر جب پھریری لی، طبیعت سے مجبور ہو کر دولتّی جھاڑ دی۔''

انشائیہ 'کرشمۂ قدرت' سے ایک اقتباس حاضر ہے:

> ''پچھلا پہر ہے۔ رات آخر ہے۔ صبح کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔ ایک گوشہ نشیں، علم کا شائق، جس کی عمر اب تک کتابوں ہی کی سیر میں بسر ہوئی ہے، اور جس کو قدرتی کرشموں پہ کچھ بھی اطلاع نہیں ہونے پائی ہے۔ اپنی عادت کے موافق شمع جلائے کتاب میں غرق ہے۔ دنیا خواب غفلت میں ہے مگر اس گوشہ نشیں کی آنکھیں اور دل دونوں بیدار ہیں۔ یکا یک شمع خاموش ہوگئی اور سارا مطلب ختم ہوگیا۔ وہ علم کا شائق جھنجھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ یہ کون دشمن علم ہے جس نے عین لطف پر ایسا اندھیر مچا دیا۔ آواز آئی: ہوا ہے، ہوا۔
>
> وہ برخواستہ خاطر گوشہ نشیں پریشان ہو کر صحن میں نکل آیا۔ ایک باغ اس کے مکان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ نسیم صبح نے پھولوں کی خوشبو اس کے دماغ میں پہنچائی۔ کچھ مزاج ٹھہرا۔ دل گرفتگی کم ہوئی۔ طبیعت شگفتہ ہو چلی مگر تعجب ہوا کہ یہ خوشبو لانے والا کون ہے؟ آواز آئی: ہوا ہے، ہوا۔'' (6)

یہ خیال کی نوجوانی کے زمانہ کی تحریریں ہیں۔ ان میں سرسید احمد خاں کی انشائیہ نگاری کی خوبیاں بھی بہ آسانی پائی جاسکتی ہیں۔ گویا ابھی وہ صاحب طرز نثر نگار اپنے اسلوب کی تراش خراش میں مصروف تھا۔ ان اقتباسات کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اوائل عمری میں خیال کے یہاں سرسید احمد خاں کی انشا کی تقلید کے آثار ملتے ہیں۔ خیال 'ادیب' کے ذریعہ افادی مضامین کے پہلو بہ پہلو فصیح و بلیغ اردو نثر کو بھی فروغ دینا چاہتے تھے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ بہار میں اس رسالے کی خدمات کو بہت جلد فراموش کر دیا گیا۔ تین دہائیوں بعد ہی 1935 میں 'بہار کی صحافت' پر مضمون لکھتے ہوئے خضر بانو خیری نے 'ادیب' کے سلسلے میں یہ کہہ دیا کہ ان کے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ 'صحیفہ فطرت کے ایک نمبر سے معلوم ہوا ہے کہ اس نام کا کوئی اردو رسالہ پٹنہ سے شائع ہوا کرتا تھا' (43)۔ جبکہ اقبال سلیم کے اس بیان میں اس پرچہ کی اہمیت کی شہادت ملتی ہے کہ 'ادیب' کی نگارشات میں موجود خیال کی 'زبان دانی اور ادب کو دیکھ کر سرسید اور عبدالحلیم شرر نے بڑی تعریف کی تھی' (3)۔ ان کے علاوہ صہبائی (40)، شائق احمد عثمانی (مغل اور اردو، 2) اور حمید عظیم آبادی (160) نے بھی لکھا ہے کہ سرسید احمد خاں اور عبدالحلیم شرر بھی 'ادیب' کی نگارشات کے معترف تھے۔ محفوظ الحق نے 1917 میں ہی یہ لکھا تھا کہ 'ادیب' کے لٹریچر کو دیکھ کر سرسید مرحوم اور مولوی عبدالحلیم شرر نے اس وقت یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر یہ رسالہ جاری رہا تو عظیم آباد اور صوبۂ بہار دلی کی تقلید سے آزاد ہو جائے گا (97)۔ 'العصر' میں شائع چند دیگر مضامین اور محفوظ الحق کی اس تحریر کے حوالے سے عابد رضا بیدار نے لکھا ہے کہ عماد الملک، نصیر حسین خیال، حالی، تعشق لکھنوی، مضطر خیر آبادی، نظر لکھنوی اور نول کشور کے وارث پراگ نرائن کے بارے

میں معاصرانہ شہادت کی اہمیت رکھنے والی ایسی تحریریں کسی دوسری جگہ کم ملیں گی (ص۔چار)۔اس لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں 'ادیب' کی اہمیت وافادیت بہار سے باہر بھی تسلیم کی جاتی تھی۔خیال کی ایسی دیگر تحریریں جن میں انشا کے یہ رنگ موجود ہیں اُن میں 'نامہذب خیرات' اور 'خلاؤں کا مارا آغا' بھی شامل ہیں۔اول الذکر کی اشاعت 1903 میں رسالہ 'اصلاح' (کھجوہ، سیوان) میں ہوئی تھی جس کے متعلق محفوظ الحق نے لکھا ہے کہ یہ پہلا مضمون تھا جسے احباب کے اصرار پہ انھوں نے اپنے اصل نام کے ساتھ شائع کروایا تھا (97)۔

1916 تک خیال اپنے تبحر علمی اور انشا پردازی کی وجہ سے پورے ملک میں صوبہ بہار کے آزاد (محمد حسین) کی حیثیت سے معروف ہو گئے تھے۔حالانکہ ان کی تمام تحریروں کے مدنظر آزاد سے ان کا موازنہ ان کی اپنی صلاحیتوں کو ماند کرنے کے مترادف تھا۔خیال نے مذہبی اور ثقافتی نوعیت کے مضامین کے علاوہ تاریخی، تنقیدی اور خالص ادبی مضامین بھی لکھے جو 'سہیل' (زیرادارت پروفیسر رشید احمد صدیقی، علی گڑھ)، 'دکن ریویو' (حیدرآباد)، 'آفتاب'، 'ہند' (کلکتہ)، 'ندیم' (گیا)، 'ادیب' (الہ آباد)، 'جادو' (ڈھاکہ) کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔ارشاد اور عثمانی صاحبان نے ان کی بعض تفصیلات پیش کی ہیں لیکن ان میں بجز رسائل کے نام اور تحریروں کے عناوین، دیگر معلومات درج نہیں ہیں۔ان میں سے جن مضامین کا ذکر عموماً ملتا ہے، ان کے عنوانات ہیں: مرثیہ اور مرزا دبیر، تزک خیال، حالات انیس، فردوسی اور انیس، ہماری زبان، ہماری شاعری۔ان کی کئی تحریریں فرضی ناموں سے بھی شائع ہوئیں۔ان میں سے ایک نام ارژنگ اور دوسرا نصیر الممالک (اس نام کا ذکر بھی موجود نہیں ہے) ہے۔

1898 میں جب کلکتہ کے فارسی اخبار 'حبل المتین' کے مدیر سید جلال الدین عظیم آباد تشریف لائے تو خیال کے مہمان ہوئے۔عظیم آباد نیز بہار میں اخبار ہذا کی توسیع اشاعت آپ کے ذمے کی گئی۔'حبل المتین' میں خود خیال کے فارسی مضامین بھی شائع ہوئے جن سے شہادت ملتی ہے (عثمانی 4) کہ وہ زبان و ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تاریخ اور مذہب کی بھی بیش بہا معلومات رکھتے تھے۔عبدالخالق (327) نے خیال کو صاحب طرز ادیب تصور کرتے ہوئے ان کے یہاں محاکاتی اسلوب کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے اور ان کی انشا پردازی کے جائزے کے دوران یہ اظہار خیال کیا ہے کہ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ایک بڑے اور کامیاب انشا پرداز کی انشا میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہ تمام خصوصیات بدرجۂ احسن نواب صاحب کی انشا میں بھی موجود ہیں۔ یعنی، الفاظ کے تصرف میں سلیقہ مندی، جملوں اور عبارتوں کی ترکیب میں حسن ربط، تخیل کی شگفتگی و پرکاری، احساس کی لطافت جب ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں تو دلنشیں انشا کا ظہور ہوتا ہے۔ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیت شگفتہ بیانی ہے۔''

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے خیال کی کتاب ''داستان عجم'' میں خیال کا موازنہ محمد حسین آزاد سے

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خیال کے یہاں آزاد کے بمقابلہ وسعت زیادہ ہے۔آزاد نے جو کہا، خیال نے اسی کو زیادہ گہرے رنگ اور زیادہ واضح انداز میں کہا ہے(7)۔

''خیال کو میں بہار کا آزاد سمجھتا ہوں۔خیال آزاد کے پیرو ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ غیر شعوری طور پر اس وادی میں ضرور داخل ہو گئے ہیں جو آزاد کی دریافت کی ہوئی اور آزاد کی بسائی ہوئی تھی۔خیال کو اس فضا میں عزت کی جگہ دی گئی۔اور اس میں شک نہیں کہ خیال نے اس اعزاز کو نبھایا۔''

ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ صدیقی صاحب نے آزاد کی زبان کو ٹکسالی اور زمان و مکان کی قید سے ماسوا تصور کیا اور خیال کے سلسلے میں عرض کیا کہ:

''خیال بہار کے تھے، بالقوای، بالطبع، باللسان اور بالانشا(اگر یہ ترکیب جائز ہو)۔ وہ بہار کے مخصوص الفاظ، لب ولہجہ اور بول چال کو ٹکسالی میں لانا چاہتے تھے۔ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ چیزیں ٹکسالی میں داخل ہو سکیں گی یا نہیں لیکن خیال نے ان کو اکثر وبیشتر جس خوبی وخلوص سے برتا یا نبھایا ہے اس سے تعجب بھی نہیں کہ کبھی ان کو ٹکسالی میں داخل ہونے دیا جائے۔''(8)

اسی کتاب میں ظہیر عظیم آبادی نے ''داستان عجم'' میں خیال کے یہاں نازک خیالی کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہی معاملہ بندی کی خوبیوں کی جانب بھی اشارے کیے اور کہا کہ خیال 'ایک ہی وقت میں ابوالکلام آزاد کے طرز کے بھی مالک ہیں، اور محمد حسین آزاد کے انداز میں بھی ماہر ہیں(3)۔پروفیسر اعجاز حسین کے یہاں بھی یہی صدائے بازگشت موجود ہے:

''نصیر حسین خیال جس پایہ کے نثر نویس تھے اس کا خیال کر کے اگر ان کو آزاد ثانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔وہی دہلی کی ٹکسالی، نرم وشیریں زبان ہے، وہی روانی اور فصاحت ان کی بھی عبارت کی جان ہے۔جس طرح آزاد روزمرہ اور عام فہم الفاظ سے تاثیر کا طلسم باندھتے تھے ویسی ہی ان کو بھی زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔''(412)

سالک لکھنوی اور عبدالخالق نے خیال پر مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد، دونوں کے ہی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔اس ضمن میں سالک لکھنوی کا یہ بیان(175) توجہ طلب ہے کہ 'الہلال' کی اشاعت کے بعد اس کے آتشیں اداریوں نے بہت سے اصحاب قلم کو اپنا مقلد بنا لیا تھا، لیکن اسی روانی میں وہ یہ بھی فرماتے ہیں(176) کہ خیال مولانا محمد حسین آزاد کے طرز نگارش سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔

درحقیقت خیال کی انشا پردازی ان میں سے کسی سے بھی براہ راست متاثر نہیں ہے۔وہ محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد، دونوں ہی سے مختلف اسلوب نگارش کے مالک تھے اور جو بھی لکھتے تھے اس میں روایتوں کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ خالص ادبی معیار کا لحاظ رکھتے تھے۔انھوں نے موضوع اور

اس کی پیشکش دونوں ہی معاملوں میں امتیازی شناخت قائم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس ضمن میں ان کا انشائیہ 'خلاؤں کا مارا آغا' بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں اطلاع تو ملتی ہے لیکن تفصیلیں کہیں نہیں ملتیں۔ جب کہ یہ اسلوب تحریر کے معاملے بالکل منفرد تخلیق ہے۔

'ادیب' کی میر حسیر عظیم آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والی ساتویں جلد کے پہلے، دوسرے اور تیسرے شمارے (بابت جنوری 1913، فروری 1913 اور مارچ 1913) میں 'خلاؤں کا مارا آغا' کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ یہ ایک طویل انشائیہ ہے۔ مارچ 1913 کے شمارے میں، پہلی دو قسطوں کی مانند، آخر میں درج ہے 'باقی دارد'۔ گویا تب تک وہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ لیکن جون 1913 کے شماروں تک پھر اس کی کوئی قسط شائع نہیں ہوئی۔ ممکن ہے اس کے بعد کے شماروں میں اس کی اشاعت ہوئی ہو۔ مجھے وہ شمارے نہیں مل سکے۔ اس کی پہلی قسط میں انشائیہ کے متن سے قبل مدیر کی جانب سے ایک نوٹ بھی شامل ہے جس سے اس زمانے میں ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے خیال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جس سکتا ہے:

''جس طرح چاشنیٔ کلام کے لیے مثل اور ذائقۂ زبان کے لیے نمک درکار ہے، اسی طرح تفریح دماغ کے لیے متانت آمیز ظرافت بھی چاہیے۔ اس کی زندہ مثال ذیل کی داستان میں دکھائی گئی ہے جو نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال عظیم آبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مضمون کی دلچسپی کو انداز بیان اور بڑھا دیتا ہے۔ اس داستان کا آغا مولانا شرر کا آغا صادق نہیں ہے بلکہ خلاؤں کا مارا۔ گربۂ مسکین بھی وہ نہیں جو فقیہ عماد کے ساتھ نماز پڑھا کرتی تھی جس کی نسبت حافظ شیرازی فرما گئے ہیں: اے کبک خوش خرام کجا می روی بہ ناز / غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد۔ یا وہ بلی نہیں جس کی نسبت مثنوی موش و گربہ میں عبید زاکانی نے لکھا ہے ع مژدہ بادا کہ گربہ زاہد شد۔'' (جنوری 26)

انشائیہ کے عنوان سے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے، 'خالہ کا کنایہ محاورے میں بلّی سے ہوا کرتا ہے۔' اس انشائیہ میں خیال نے جو بے مثل لسانی تجربے پیش کیے ہیں وہ نہ تو محمد حسین آزاد کے یہاں ملتے ہیں اور نہ ہی ابوالکلام آزاد کے یہاں۔ پٹنہ اور کلکتہ میں ایرانیوں سے اپنے ربط ضبط کی وجہ سے خیال نے ان کی زبان کی خوبصورت پیشکش کی ہے۔ اس انشائیہ میں ایک ایرانی شخص موسوم بہ آغا کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ بڑے گھروں کی ملکی و غیر ملکی چند فیشن ایبل خواتین ہیں۔ ان سب کے ساتھ مصنف، اور ان کی دنیا کی سیر۔ مکمل انشائیہ میں اعلیٰ طبقہ کی معاشرت پہ لطیف طنز موجود ہے۔ آغا کے ذریعہ استعمال کی جانے والی فارسی اور اردو کی کھچڑی کو دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہوئے مزاح کی آمیزش بھی کی گئی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''ڈَرَم ڈَرِڈ۔ دارجلنگ میں بہترین ہوٹل ہے اور میرے تجربے میں تو یہاں گھر کا

آرام ملتا ہے۔اس دفعہ کی گرمی خدا کی پناہ! الٰہی توبہ! پھر خدا نہ دکھائے! کچھ تو اس سے سوا بعض شکایتوں کے سبب کلکتہ چھوڑ کر آخر پہاڑ پر بھاگنا پڑا۔ راستہ میں مسٹر رفیل، مسز رفیل، ان کی ایک سیانی لڑکی اور اس کی ادھیڑ خالہ ہمسفر مل گئیں۔ اچھے اور ملنسار لوگ بمشکل ملتے ہیں۔ آخر یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ ہم سب دارجلنگ پہنچے اور اسی ڈرم ڈرد میں اترے۔ دن کے کھانے میں قید نہ تھی، ہاں، رات کو ہم سب ایک ہی میز پر ساتھ کھاتے تھے۔ میز گول تھی۔ صدر کوئی نہیں، اور پھر سب صدر۔ مسز رفیل کی لڑکی مس فرحا کو اگر صدر مان لیں تو عموماً یہ نشست ہوتی تھی۔ اس کے دائیں طرف باپ، بائیں پر ماں، اس کے بعد خالہ، میں اور مس فرحا آمنے سامنے...

ہم سب کھاتے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ پُسی (بلی) کو وقت معلوم تھا۔ آدھا کھانا ختم ہو چکتا تو وہ پہنچتی۔ فرحا نے زانو بدلا تو سمجھے کہ پسی آئی۔ بے تکلف گود میں جا بیٹھی۔ ایک سجی رکابی منگائی گئی۔ سب نے اپنے آگے سے تھوڑا تھوڑا سا اس میں ڈالا۔ فرحا نے منھ سے منھ ملا کر اسے پیار کیا۔ اس کا نیلا پٹا درست ہوا۔ گرہ مضبوط دی اور اٹھا کر میز پر چھوڑ دیا۔ وہ گلدان سے مل کر بیٹھی۔ رکابی کی طرف جھکی، منھ ڈالا اور مشغول ہوگئی! پسی سب کو عزیز تھی۔ پیش خدمت، باورچی، خانساماں یہانتک کہ مہتر بھی چاہنے لگا تھا۔'' (جنوری 26)

اسی مطعم میں ایک ایرانی نوجوان ہے جسے بلّیوں سے وحشت ہوتی ہے۔ اس کے ذکر کے بعد باتیں بلیوں سے ان کی میموں تک پھیلتی جاتی ہیں اور خیال اچھوتے لہجے میں آغا کی متنوع وحشت انگیزیوں کی تصویرکشی کرتے جاتے ہیں۔

''آج پُسی کو میز پر قرار نہیں۔ دن بھر کھیلنے نہیں ملا۔ اب خوش فعلیوں پر ہے۔ فرحا نے اس کی ریشمی ڈوری کرسی کے بازو میں باندھ دی ہے۔ وہ میز پر سے کبھی نیچے کبھی اوپر۔ ابھی فرحا کے زانو پر تھی، ابھی اس کے کاندھوں پر پہنچی۔ گردن پر منھ رکھ کر لگی بالوں کی خوشبو سونگھنے۔ ہوٹل میں شاید اس کا چرچہ ہو۔ ایک ایک کر کے دیکھنے آیا۔ بعض جھانک ہی کر بھاگے۔ بعض قریب بھی آئے، مگر اس جوان کی طرف پیٹھ کیے ہوئے۔ باورچی بھی پہنچا، چولھے پر ہنڈیا چڑھی چھوڑ کے آیا۔ ایک نے دوسرے کو دکھایا۔ پسی کے نصیب پر شاید سب نے رشک کھایا۔ اس وقت بعض نک چڑھے حکام بھی ادھر ہی مخاطب تھے۔ اکثر پڈنگ چھری سے کاٹنے لگے۔ ادھر سے نظر ہٹی تو اپنی حرکت پر شرمائے، چھری الگ کی اور پھر لگے دیکھنے۔

آج کھانے میں بڑی دیر لگی۔ مینو الٹ پلٹ ہوگیا۔ پڈنگ کے بعد مرغی آئی۔ سب

نے کھا بھی لی۔ میووں کو سب بھولے۔ شاید کھانے اور کھلانے والے دونوں زیادہ پی گئے تھے۔ پوچھتا اور یاد رکھتا کون! دس کے بعد کہیں کمرہ خالی ہوا۔ نہ معلوم وہ جوان کب اٹھا! کسی نے خیال نہیں کیا۔ مسز رفیل اٹھیں تو ہم سب بھی اٹھے۔ پسی جس شان سے آئی تھی اسی شان سے سدھاری۔ ہم نے کمرے تک پہنچا بھی دیا۔ خدا حافظی کی، اور رخصت ہوا (جنوری 27)۔

آج کئی دن سے ہُلّڑ تھا کہ سنیچر کی رات کو رنک میں فینسی ڈریس بال ہونے والا ہے۔ جانے والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں۔ کلکتہ سے کپڑے اور سامان تار دے کر منگائے گئے تھے۔ مسٹر رفیل نے سپیرے کا روپ بھرا۔ مسز رفیل اس بڑھاپے میں سدا سہاگن بنیں۔ ان کی بہن کو بھوٹنی کا جامہ بھایا۔ رہ گئیں فرحا۔ دوپہر تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ آج کیا کرنے والی ہیں۔ ماں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ تم نے اپنے لیے ابھی تک کچھ نہں سوچا۔ وہاں تین بجے تک تصفیہ ہی نہیں ہوا تھا۔ چائے کے وقت فرمائش ہوئی کہ مسز جمشید کے یہاں سے ساری آئے۔ آدمی دوڑا گیا۔ بیچاری نے اپنی نئی ریشمی دھانی ساری نکال کر فوراً بھیج دی۔ شلوکہ بھی ساتھ کر دیا اور لکھا کہ ساری باندھ نہ سکو تو ہم آئیں۔'' (جنوری 28)۔

اسی دوران آغا سے آشنائی کے بعد راوی اور اس کے درمیان دلچسپ گفتگو بھی شروع ہو جاتی ہے جسے اس تحریر میں شگفتہ اسلوب اور مزاح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مکالمے ملاحظہ فرمائیں۔ اردو سیکھنے اور بولنے کے شوق میں ادائیگیٔ الفاظ کے دوران آغا کے لہجے سے پیدا ہونے والے معنوی خبط دلچسپ پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں:

''آقا وہ ماہ جنوری تھا۔ فروری و مارچ دو ماہ الحمدللہ خوش گذشت۔ قدرے از احوال دنیا ہم آشنا شدہ بودم۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ وُو (وہ) ہوتل خیلے بزرگ مثل یک بہشت تازہ بر زمِن (زمین) بود نعمات و تکلفات گوناگوں برائت مہمانان فراہم آوردہ بودند۔ از ماہ مارچ سیاحان دنیا می آمدند در پاریس و اقامت می کردند در اِن (ایں) ہوتل۔ ایں کیست آغا؟ بابا اِں (ایں) زنِ یک امیر کبیر امریکائیست! دیروز کی مہمان شدہ؟ دخترِ دِیوک آف اِدِمبرا۔ اِن تلگراف از کجا آمدہ؟ از ہندوستان مہاراجا بڑودہ از بامبئی حرکت کردہ۔ می آیند۔ خیر۔ دیشب دو اُطاق (کمرہ) مخصوص کہ کرایہ کردست (کردہ است) اِن کیست آغا؟ نمشناسی (نمی شناسی)! عجیب! سرآغا خون (خاں) ست درلندن بود۔ حالا بہ پاریس آمدہ برائے تفرج و سیر و عیش و نشاط! خوب میسیو سولمن امروز چرا بر موتو کار خود استاسون (اسٹیشن) رفتہ ست۔ چہ کار

دارد؟ نمی دانی۔ عجیب! خذیو مصر و ولیعہد دولت زاپوں (جاپان) ہر دو تشریف می آرند۔
سولمن برائے استقبال رفتست (رفتہ است)!
غرض آقا، ہم کیا عرض کریں۔ روز و شب اس ہوٹل کا یہی نقشہ تھا۔ کسی وقت فرصت
نہیں، آرام نہیں۔ تخلیہ نہیں کہ یک دو شعر موزوں کر سکوں۔ آقا، یہ پھر غنیمت تھا۔ مگر
جبکہ ماہِ مائی (مئی) آیا۔ اُف! آقا واقعی پی (بے) حال بودم۔ یک مرتبہ سہ درجن
خواتین امرائے کبارِ دنیا مثل مرغابی ہائے رنگین و مختلف اللّون کہ در کنار یک تالاب
جمع می شوند در اِن (ایں) ہوٹل جا گرفتند (گھسیں)۔ آقا (مارچ 136)!

درج بالا اقتباسات 'خلاؤں کا مارا آغا' کی مختلف قسطوں سے ماخوذ ہیں۔ تیسری قسط (مارچ 1913) میں بھی متن سے پہلے مدیر کا ایک نوٹ شامل ہے جس میں انشائیہ کے سلسلے میں قارئین کے ردِّعمل کا اظہار کیا گیا ہے۔

''اس مضمون کی جیسی حیرت انگیز عالمگیر پسندیدگی ہوئی ہے اس سے نقادانِ فن کی نکتہ
سنجی اور زندہ دلان اردو کی شگفتگیٔ طبع و مذاق سلیم کا کافی ثبوت ملتا ہے، اور ہمیں بخوبی
اس کا اندازہ ہو گیا کہ اردو کی دنیا کیرکٹر (عادات و خصائل) نگاری کا خیر مقدم کرنے
کو تیار ہے۔ اس بنا پر ہمارا یہ کہنا فضول نہ ہوگا کہ اس طرز انشا پردازی میں بھی ہماری
زبان یورپ کی زبان سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی...
...پسندیدگی کے جتنے حوصلہ افزا پیغامات قدر دانان ادیب نے بھیجے تھے، نہایت شکر
کے ساتھ نواب خیال صاحب عظیم آبادی کے پاس بھیج دیے گئے ہیں۔ اور واقعی
ممدوح ہر طرح مستحق داد ہیں۔'' (مارچ 136)

2

نصیر حسین خاں خیال کی نثر نگاری کی دوسری بہترین مثال ان کی تصنیف 'داستان عجم' ہے جس کی اشاعت پہلی بار 'ہند'، کلکتہ کے 1934 کے شماروں میں ہوئی۔ بعد ازاں شاد بک ڈپو، پٹنہ نے اسے رشید احمد صدیقی کے پیش لفظ کے ساتھ 1935 میں شائع کیا۔ اس کا مکمل عنوان ہے: ''داستان عجم یعنی تبصرہ بر شاہنامۂ فردوسی''۔ اس سے قبل ان کا ایک مضمون انیس اور فردوسی کے موازنے پر بھی شائع ہو چکا تھا۔ شاد بک ڈپو نے یہ کتاب برقی مشین پریس، بانکی پور، پٹنہ میں چھپوائی تھی۔ کتاب 154 صفحات کی ہے جس کے آخری تین صفحوں پر اشتہارات ہیں۔ پہلا اشتہار شاد بک ڈپو کے ذریعہ ''مکتوبات خیال'' کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون کے لیے ہے۔ اس کے بعد شاد عظیم آبادی کی کتابوں، ''فکر بلیغ''، 'ظہور رحمت' اور 'مادر ہند' کا اشتہار ہے۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر خیال کی تصویر ہے جس سے اوپر سیماب اکبر آبادی کی یہ رباعی درج ہے:

خاموش ہے کیوں مرثیہ خوان اردو　　تھا ختم ابھی کہاں بیان اردو
نیند آ گئی داستاں سنانے والے اب　　کس سے سنیں گے داستان اردو

نچلے حصے میں ظہیر عظیم آبادی کی رباعی درج ہے۔

تصویر خیال کھینچتی ہیں آنکھیں　　صد نقش کمال کھینچتی ہیں آنکھیں
ظاہر ہے ادیب ملک کے خامہ سے　　کیا بال کی کھال کھینچتی ہیں آنکھیں

کتاب کی ابتدا پروفیسر رشید احمد صدیقی کے تعارف سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد عباس شوشتری کا مقدمہ بہ زبان فارسی شامل کیا گیا ہے۔ شاد بک ڈپو کے مینیجر سید ظہیر احمد شمسی عظیم آبادی (جن کا شعر اوپر درج ہے) نے اس کے بعد احوال واقعی کے عنوان سے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ یہ حصے اصل کتب کے علاوہ 30 صفحوں پر محیط ہیں۔

وسعت علم وخیال، کلاسیکی مشرقی ادب اور اس کے ثقافتی پہلوؤں کے انسلاکات اور انداز بیان کے معاملے میں خیال کی تمام تحریروں میں یہ کتاب سب سے زیادہ اہم ہے اور حیرت کی بات ہے کہ ان کے سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا یا کہا گیا اس میں اس کتاب کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہم شعر و ادب اور اس کی تاریخ کے سلسلے میں کسی بھی ادیب کے خیالات سے متفق نہ ہوں۔ اس کے باوجود یہ گنجائش تو رہتی ہے کہ اس کی ان خوبیوں کی نشاندہی کر دی جائے جو اس کا اختصاص ہے۔ خیال کے معاملے میں ایک صورت حال یہ بھی ہے کہ ان کے انشا، ان کے تبحر علمی، ان کے مقاصد اور ان کے خاص نقطۂ نظر کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سب ایک دوسرے سے ہم بست ہیں۔ ایک مرکزی تصور ہے جو مختلف نوعیّتوں سے مختلف سانچوں میں ڈھلتا گیا ہے۔ یہ مرکزی تصور ہندستان کے خمیر سے، سنسکرت شعریات سے، مادر وطن کی فکری اور نظری روایتوں سے نمو پاتے ہوئے اپنے دامان خیال میں مکمل مشرقی ثقافت کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ اگر مشرقی شاعری اور خاص طور پہ اردو شاعری کو یہ پس منظر مہیا نہ ہوتا تو ہماری تحویل میں، مثال کے طور پر، غالب کے اتنے رنگ نہ ہوتے۔ ستّر کے بعد کی دہائیوں میں اردو میں تنقید نے جن بعض روشوں کو اپنایا ہے ان کے ابتدائی اور ناپختہ نقوش ہمیں خیال کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس کتاب کے تعارف میں کتاب کے سلسلے میں کچھ نہ لکھ کر محض خیال کی انشا پردازی کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ''داستان اردو' سے چند اقتباسات کو پیش کیا ہے جو اس میں 'آریوں کی آمد'، 'مہابھارت'، اور 'رام لیلا اور بھرت ملاپ' کے نام سے شامل ہیں۔ ایک اقتباس 'داستان عجم' سے بھی ہے جس میں خیال نے رستم وسہراب کا معرکہ ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ مثالیں ان سے بہتر بھی موجود تھیں۔ صدیقی مرحوم نے لکھا ہے کہ انھیں 'نواب مرحوم کی بعض ان تاویلات سے اتفاق نہیں ہے جو انھوں نے 'داستان اردو'، 'داستان عجم' یا 'ہماری شاعری' میں پیش کی

ہیں۔نقد و جرح کا یہ محل نہیں ورنہ عرب وعجم، ایران و تا تار، فردوسی و انیس کے سلسلے میں بعض ایسے مباحث چھڑ گئے ہیں جہاں باوجود کوشش کے میں نواب خیال کے ساتھ ہم نورد نہ رہ سکا‘ (داستان عجم 10-11)۔ اس کے باوجود اختتامی جملے قابل توجہ ہیں:

’’[خیال کی] طبیعت مشرقی تھی، انداز مغربی۔ اردو پر جان دیتے تھے۔ اور اردو کی ہر بڑی تحریک سے اپنے کو وابستہ کرتے۔ اپنی خاندانی وجاہت اور امارت پر فخر کرتے تھے اور صحیح بھی ہے کہ جس طرح اودھ میں انیس اور ان کے خاندان نے اردو کی پشتہا پشت خدمت کی، نواب مرحوم اور ان کے خاندان نے بھی مدت مدید تک بہار میں اردو کا علم بلند رکھا اور جس زمین کو انیس نے آسمان بنایا اس میں نواب مرحوم اور ان کے خاندان نے مہہ واختر چمکائے۔‘‘(21)

کتاب ’داستان عجم‘ کی شروعات باب ’آہورامزدا‘ سے ہوتی ہے۔ اس میں عرب وعجم اور ایران و توران کی قدیم ثقافتوں کا ذکر کرتے ہوئے خیال دفعتاً اپنی اصل منشا کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ غدر سے قبل کے ملکی حالات اور اس وقت کی ادب گردی کا ذکر کرتے ہوئے انیس کی مرثیہ نگاری موضوع بنتی ہے۔ پھر یکلخت عرب وایران وتوران سے اٹھ کر ملک عزیز کی مٹی کی خوشبوؤں میں سانسیں لینے لگتے ہیں۔

’’جنگ کربلا میں روز عاشور (حضرت) علیؑ اکبر کی رخصت ہے۔ امام حسینؑ کے سے باپ چشم پرآب ہیں۔ بیٹے کو لے کر خیمہ میں بہن (حضرت زینبؑ) کے پاس جاتے اور رخصت اکبر کا ذکر چھیڑتے ہیں... امام کا مطلب سمجھ کر

بولی وہ عندلیب چمن پرور بتول
طرہ وہی ہے سب پہ مہیسر چڑھے جو پھول

اے فرزند رسول۔ ہاں اکبر کی جدائی کا غم ہوگا۔ مگر ان کے ایسے عزم پر سب نثار۔ سہہ لوں گی۔ آج کی یہ قربانی تو ہماری چادر عزت کا طرہ اور اس پھول سے مشابہ ہے جو مہیسر کے سر چڑھا ہو!

اب جب تک تم اپنی ملکی و مذہبی روایتوں کو نہ جانو اور اس ہندی ماتا کو نہ سمجھو جو اپنی عفت وعصمت کی بدولت دیوی بنیں اور پوجی گئیں، جن کی مورتی مہیسر کہلائی اور اس پر منت کے پھول چڑھنے اور مرادوں کے گیندے اترنے لگے، اس بیان کا کیا مطلب سمجھ سکتے اور کیوں کر اس سے اثر لے سکتے ہو۔‘‘(9)

اس کے بعد واضح انداز میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں:

’’اتنے بڑے قصہ سے ہمارے یہاں مہیسر کے پھول کا سا نازک محاورہ پیدا ہو گیا۔ ان دیوی پر جو پھول چڑھتا اور ان کے سر پر رہ جاتا وہ سب پر بالا (طرہ) شمار

ہوتا۔ یہ ہمارا قدیم (ملکی و مذہبی) محاورہ عصمت مآب حضرت زینبؑ کی زباں سے ادا کروا کے کس موقعہ پر یاد دلایا گیا۔ انیس کے اس مہیبر کو جانے بغیر افصح عرب کی نواسی کا کلام تم نہیں سمجھ سکتے، اور اس لیے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے(10)!

اس مثال کے بعد خیال یہ صراحت پیش کرتے ہیں کہ جس طرح کلام ہندی کے سمجھنے کے لیے اتنی نکتہ فہمی ضروری ہے اسی طرح فردوسی کے شاہنامہ کو اس کے جمشیدی جام، نوروزی صبح، ماہ وسال کی تقسیم، جام جہاں نما سی تقویم، دَہاک (معرب ضحاک) کے مارنما زخموں، زال و سیمرغ، رستم و ہفت خواں، سہاب کے گلگوں اور ترکمانی کھیتوں کی اصالتوں کے علم کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ انھوں نے شاہنامہ میں شامل ایسے تمام عناصر کی بہت ہی دلفریب اور موثر تفصیلیں پیش کی ہیں۔ ان کی وجہ سے شاہنامہ کے اہم کردار اور واقعہ، اور اس کے پس پردہ موجود تاویلات کی وسیع دنیائیں زندہ و پائندہ ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب عجم کا اصل مقصد عجمیوں کی حرکت قلب کو تیز کرنا تھا۔ وہ مطلب تورانیوں اور ایرانیوں کی جنگوں کے بیان اور رستم کی غیر معمولی شجاعت اور وطن کی محبت اور اس کے دفاع میں اس کی طاقت و ہمت کے ذکر خیر سے پورا ہو گیا(76)!''

یہاں وہ عظیم ادب یا ادب عالیہ کی تخلیق کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کتابیں کسی خاص غرض سے آتی ہیں اور اپنا کام کر جاتی ہیں۔ شاہنامہ کی بھی ایک غرض تھی۔ مردہ دل ایرانی اسے پڑھ پڑھ کر زندہ ہوئے اور اسے حفظ کر کے صدیوں کی غلامی سے آزاد ہونے اور عراقیوں کے پنجۂ ظلم سے نکلنے کی فکر کرنے لگے۔ اور اس میں وہ کامیاب ہوئے۔''

یونانی منطق و فلسفہ اور افلاطون و ارسطو کے نظریات نے جس طرح رومنوں اور عربوں کو ذہنی پستی کی جانب مائل کر دیا، اسی طرح فارسیوں نے بھی اس 'شل کر دینے والے فلسفہ و منطق' کا راگ الاپ کر ایران کو مدتوں کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن ان بداعمالیوں کے بعد بھی شاہنامہ ایران میں اور طرح طرح کچھ دنوں زندہ رہا۔ وہاں کے اہل حواس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کعبۂ ادب کے آگے سر جھکایا(81)۔

سعدی، نظامی اور انوری کی شاہنامہ کے تئیں عقیدت کا بیان کرتے ہوئے وہ ان نشیب و فراز اور ذہنی قلاشیوں کی جانب اشارے کرتے ہیں جن کی وجہ سے'' شاہنامہ'' کی قدر و منزلت خود ایرانیوں کے یہاں کم ہوتی گئی۔

فارسی ادب کا جوان پھر اپنی وردی میں نظر نہ آیا۔ صفویوں نے اس کا لباس اتارا، اور ان کے شاہ حسین نے تو اسے ننگا ہی کر دیا۔ اس وقت کے ادب نے فردوسی کے رستم دستاں کو سیستاں ہی میں نہیں، اصفہان میں بھی ہمیشہ کے لیے گاڑ دیا۔ آتش کدۂ

ایران افغانیوں کے سے فُغانیوں کے ہاتھوں سے سرد ہو کر ماتم کدہ بن گیا۔ پھر ترکوں کی لکد کوب سے وہ اور اجاڑ ہوا، اور قاچار نے اسے لاچار کر دیا۔صدیوں کے بعد اب ملک ملکیوں کے ہاتھ آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہلوی فارسی بن جائیں، شاہنامہ کھلے، رستم نکلے اور عجم تازہ دم ہو جائے (83)۔''

بنیادی طور پر یہ کتاب خیال کے تاریخی شعور اور اس کے پس منظر میں ادب کی آفاقی قدروں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

''داستان عجم' کا ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں خیال نے مغربی محققین کے حوالے سے بعض کردار و واقعات کا موازنہ کلاسیکی مغربی ادب کے شاہکاروں سے کیا ہے۔ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''انگلستان کا شیکسپیئر بھی ڈنمارک کی زمین پر یہی سین کھینچتا ہے۔ہمارے یہاں خسرو کا باپ سیاوش قتل کیا جاتا ہے اور وہاں ہیملٹ کا باپ شاہِ ڈنمارک۔شاہنامہ میں سیاوش کا قاتل اس کا خسر افراسیاب ہے، اور شیکسپیئر کے یہاں شاہ ڈنمارک کا قاتل اس کا بھائی ہے۔فردوسی خسرو کو دیوانہ بناتا اور اس کا معلم پیران ویسا کو بتاتا ہے، اور شیکسپیئر ہیملٹ کو بری ارواح سے تعلیم دلوا کر پاگل بنا دیتا ہے۔ ہمارے یہاں خسرو کا مخاطب اس کا نانا افراسیاب ہے اور تمہارے یہاں ہیملٹ کا چچا، غاصب شاہ ڈنمارک (48)۔''

خیال نے اپنے تلازمۂ خیال کو مستند بنانے کے لیے عربی، فارسی اور انگریزی تصانیف کے حوالے پیش کیے ہیں۔کیخسرو، لہراسپ و گشتاسپ، رستم وسہراب، درفش کاویانی، تازی و فارسی، عرب و عجم، زردشت و مانی، ہندستان کی فارسی اور اردو شاعری پہ شاہنامہ کے اثرات، شاہنامہ میں ہندی و چینی عناصر کی جستجو وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر خیال نے بہت ہی لطیف پیرائے میں گفتگو کی ہے۔ایک کامیاب انشا پرداز کی طرح ان کے یہاں موقع ومحل کے لحاظ سے متنوع آہنگ بیان بھی موجود ہے۔

خیال کی رایوں سے اتفاق یا اختلاف کیے بغیر ان کے علم کی وسعت، باریک بینی، عمیق مشاہدوں اور حسن بیان کو مدنظر رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا ناممکن نہ ہوگا کہ ان کے اسلوب نگارش کے منفرد انداز واطوار ہیں۔ان سب آمیزشوں کے باوجود ان کا مخصوص اسلوب ہے جس میں اردو، فارسی، عربی الفاظ اور ان کے مختلف تلازمات کے ساتھ ہی ٹھیٹھ ہندی الفاظ وفقرے برمحل استعمال ہوئے ہیں۔ 'داستان عجم' سے چند مثالیں دیکھیے :

''...تو شہزادہ بے اختیار جوش میں کھڑا ہو گیا۔خیمہ سے اُپی تلوار لیے نکلا، گھوڑے پر

بیٹھا،حملہ کا حکم دیا،فوج نکلی، بڑھی، دشمنوں پر جا پڑی(33)۔

کاوَہ نام کا ایک آہن گر تھا۔ اس نے اپنی جماعت تیار کی۔علم بغاوت نکالا۔ اس کا پُھر ہرا کاوہ کی بھاتی (وہ چمڑا جس سے لوہار آگ پھونکتے ہیں) کا تھا۔علم کا نکلنا تھا کہ خلقت ٹوٹی اور اس کے ساتھ ہو گئی۔ کوہ البرز پر فریدوں اب جوان تھا۔ اس بغاوت کی خبر کسی طرح اسے بھی پہنچی۔ اپنے خاندان کے دشمن جمشید کے عدو اور اپنے باپ کے قاتل، غیر ملکی ضحاک سے بدلہ لینے نکلا۔ ہتھیار درست کیے۔ ایک گرز بنایا۔ اس پر اپنی پُر مایہ(وہ گائے جس کے دودھ سے پَلا تھا) کے سر کی نقل بنا کر بہ طور یادگار رکھی اور چلا۔ یہ گرز گاؤ سر تاریخی بنا۔ وہ نریمان کو عنایت ہوا۔ پھر سام و زال پاس رہا اور اخیر میں رستم کے ہاتھ میں آ کر بڑے بڑے معرکے سر کرتا رہا۔

فریدوں کاوہ سے ملا۔ عجمی ساتھ ہوئے۔ کاوہ اپنا علم لیے شہزادہ کے ہمراہ ضحاک پر چڑھا۔ وہ بھاگا۔ آخر پکڑا گیا۔ قید ہوا اور فریدوں شاہ ایران بنا۔ کاوہ کا وہ علم دُرفش کاویانی کے نام سے دنیا میں بلند نام ہوا۔ یہ دُرفش ایرانیوں کا قومی نشان تھا۔ وہ تورانیوں اور افراسیابیوں کے مقابلے میں بھی نکلتا اور اپنا اوج دکھاتا رہا (54-53)۔

شاہنامہ میں سیاوش کا حال دیدنی ہے۔ وہ آگ کی مصیبت سے چھوٹا تو سودابہ کے اور جالوں میں پھنسا۔ رانی کیکئی نے اجودھیا سے رام کو نکلوایا۔ انھیں بن باس ہوا۔ دکھن پہنچے۔ وہاں لڑے اور لڑائی جیتے۔ اور پھر گھر آ کر راج رجتے رہے! ایران میں سیاوش،سودابہ کے چرتر سے، افراسیاب کے مقابلے پر توران بھیجا گیا... مصر میں بھی یہی ہوا۔ زلیخا نے (حضرت) یوسفؑ کو آخر پھنسایا۔ قید ہوئے۔ رہے۔ کڑیاں جھیلے۔ چھوٹے تو افسر مصر اور زلیخا کے سرتاج بنے۔'' (119-118)

ایسی عبارتیں 'داستان عجم' ہی نہیں، 'مغل اور اردو' اور 'داستان اردو' کے ساتھ ہی مختلف مضامین میں بھری پڑی ہیں۔ یہ کتاب خیال کے عمیق ثقافتی علم، ان کی نکتہ سنجی و زبان دانی اور تنقیدی بصیرتوں کی بہترین مثال ہے۔ اس سے قبل 'سخندان فارس' میں محمد حسین آزاد نے بھی ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی لیکن مصطلحاتِ شاہنامہ کو سمجھانے میں خیال نے نسبتاً دلچسپ انداز نگارش اختیار کیا ہے۔ پُر وقار زبان میں ایران کی ثقافت کی تاریخ، فارس کے حالات اور فردوسی کی شاعری کے ثقافتی پہلوؤں پر یہ تبصرہ علمی نثر کا خوبصورت نمونہ بھی ہے۔

عرصہ قبل قدوس صہبائی نے خیال کے سلسلے میں ایک جامع تبصرے کے دوران کہا تھا کہ جن نقادوں اور اردو کے محققوں نے نواب نصیر حسین خیال پر کچھ لکھا ہے ان میں سے اب تک ان کی نظروں سے جو چار پانچ مضمون گذرے ہیں ان میں نواب موصوف کے اصل مقام اور طرز نگارش و اسلوب کے متعلق

مفصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ لیکن ہر لکھنے والے نے یہ قدر مشترک تسلیم کی ہے کہ زبانوں کی تاریخ میں جب تک اردو زبان کا نام باقی رہے گا، نصیر حسین کا نام بھی ایک بے مثل ادیب کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا۔

> ''نواب ایک منفرد اور مخصوص طرز تحریر کے مالک تھے۔ اب تک مشکل ہی سے اس اسلوب اور طرز انشا پردازی میں لکھنے والا کوئی ادیب پیدا ہوا ہے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ سمجھی گئی ہے کہ وہ اپنے مضمون کے لیے جو موضوع تلاش کرتے تھے اس کی نوعیت کے مطابق الفاظ استعمال کرنے پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔
> حسن ترتیب ان کے مضامین کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اس احساس توازن سے ان کی تحریروں کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ الفاظ کی شوخی اور بانکپن کے باوجود عبارت میں بے انتہا سادگی اور روانی ایک پڑھنے والے کو پوری طرح محویت اور جذبیت کے عالم میں پہنچ جانے سے نہ روک سکتی تھی (39)۔''

ٹھوس اور خالص علمی موضوعات پر دسترس کے ساتھ ہی انشا میں لطیف طنز اور ظرافت کا استعمال ان کی نثر کا بہترین وصف ہے۔ 'شاہنامہ' جیسی کتاب پر لکھنے کے دوران بھی ان کا یہ مخصوص انداز اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ موجود رہا، اور جب اردو کے عہد طفلی سے اس کے شباب تک کے مراحل کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں بھی یہ رنگ و آہنگ اپنی جلوہ سامانیاں بکھیرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ خیال نہ تو محقق تھے اور نہ ہی نقاد لیکن شعر و ادب کے ثقافتی مطالعہ میں جتنی دور بینی اور گہرائی ان کے یہاں ملتی ہے اس کی مثالیں ان کے معاصرین میں کم ملتی ہیں۔ خیال کی تحریروں کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں موجود عظیم آبادیوں (یا بہاریوں) کے روزمرہ جس کے ٹکسالی بننے کے سلسلے میں پروفیسر صدیقی نے شبہات کا اظہار کیا تھا، ان کے محاوروں، مثلوں، کنایوں، تلمیحوں، الفاظ کے محل استعمال، مترادفات کے نازک فرق، اظہار جذبات کے طریقوں، فصاحت کے رمز اور بلاغت کے نکات سے (ظہیر 3) بہرہ ور ہوا جائے اور ان کے جذبہ وخلوص کی صداقت کا اقرار کیا جائے۔

اس جائزے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ خیال کے منفرد اسالیب نگارش تھے جو ان کے انشائیوں، ادبی مضامین اور مکتوبات میں الگ الگ نوعیتوں میں نمایاں ہوئے ہیں۔ انشائیوں میں زبان کے اختراعی استعمال کے ساتھ ہی شوخی و بذلہ سنجی بھی ہے، لطیف طنز کی آمیزش بھی، وہیں ادبی مضامین میں علمی اور تخلیقی نثر کی تمام خوبیاں، اور مکاتیب وخودنوشت میں سلیس وسادہ نثر کی خوبصورتیاں موجود ہیں۔ لہٰذا، نثر نگاری کے معاملے میں انھیں محض مولانا محمد حسین آزاد یا مولانا ابوالکلام آزاد کا مقلد کہنا ان کی نثر کی امتیازی وانفرادی خصوصیات سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

(الف) راقم پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر، رامپور رضا لائبریری، رامپور کا ممنون ہے جن کے ذاتی ذخیرے سے اس شمارے کا عکس موصول ہوا۔

حوالہ جات

(1) احسن،محفوظ الحق۔'نواب نصیر حسین خان صاحب خیال' العصر، جلد 6،نمبر 2، مئی 1917۔ص 99-96۔
(2) ادیب۔(پٹنہ، مدیر نصیر حسین خیال) جولائی، 1897؛ ستمبر 1897۔
(3) احمد، سید بدرالدین۔حقیقت بھی کہانی بھی۔ پٹنہ: بہاراردو اکادمی، 2003۔
(4) بیدار، عابد رضا۔العصر کا انتخاب (1917-1913)۔ پٹنہ: خدا بخش لائبریری، 1980۔
(5) خیال،سید نصیر حسین خان۔'کرشمۂ قدرت' ادیب، پٹنہ۔ستمبر 1897،ص 8-6۔
(6) ... 'موسم بہار کی ایک رات کا خواب' ادیب، پٹنہ۔ستمبر 1897،ص 22-16۔
(7) خیال، نصیر حسین۔'خالاؤں کا مارا آغا' ادیب (الہ آباد۔ مدیر حسیر عظیم آبادی)، جنوری تا جولائی 1913 کا مشترکہ شمارہ۔ جنوری 1913،ص 34-26؛ فروری 1913،ص 71-64؛ مارچ 1913،ص 142-136۔
(8) ... داستان عجم۔ پٹنہ: شاد بک ڈپو، 1935۔
(9) خیال، ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں۔مغل اور اردو۔کلکتہ: شائق احمد عثمانی اینڈ سنز پبلشرس، 1933۔
(10) ... داستان اردو۔ (اقبال سلیم۔مرتب) حیدرآباد: ادارۂ اشاعت اردو، 1945۔
(11) خیری، خضر بانو۔'بہار کی صحافت' بہار میں علوم وادبیات (بہار کے مشاہیر کے قلم سے)۔ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 2000،ص 43۔
(12) صہبائی، قدوس۔'نصیر حسین خیال' نگار، مئی 1955،ص 41-38۔
(13) عالم، محمد منصور۔ بہار میں تذکرہ نگاری۔ پٹنہ، کتاب منزل، 1980۔
(14) عبدالخالق۔اردو نثر کے اسالیب۔ پٹنہ، 1984۔
(15) عثمانی، ابوذر۔'بہار میں اردو تنقید کا ارتقا' صنم (پٹنہ، بہار نمبر)، 1955۔
(16) عظیم آبادی، حمید۔۔'بہار اور اردو' ندیم (گیا، بہار نمبر)، 1940۔
(16) ہاشمی، ارشد مسعود۔'نصیر حسین خیال' فکر وتحقیق (نئی دہلی)،(VII/2) اپریل تا جون 2004،ص 168-149۔

Prof. Arshad Masood Hashmi
Head, Department of Urdu
Jai Prakash University
P. G. Building, Gudri Main Road
Chapra 841301 (Bihar)
hashmiam68@gmail.com
Mob.: 99345 02098